© rasailojaraid.com

مولانا محمد طاسین

مشینوں پر زکوٰۃ کا مسئلہ

ماہنامہ بیّنات کراچی میں مشینوں پر زکوٰۃ کے سلسلے میں ایک علمی بحث چھڑی تھی، ایک طرف پاکستان کے عظیم دانشور اور سائنسی دَور کے موجوؔد معاشی مسائل کے ماہر مولانا محمد طاسین صاحب تھے اور دوسری طرف حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب اور مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کے ایک دوسرے بزرگ مفتی صاحب تھے۔ یہ سلسلہ شروع میں تو خالص علمی رنگ کا تھا، لیکن افسوس کہ بعد میں مباحثہ اور مجادلہ کی صورت اختیار کر گیا اور مولانا طاسین صاحب کی تردید میں مؤقر بیّنات میں ایک مضمون شائع ہوا جس سے حلقہ علماء میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی۔ مولانا محمد طاسین صاحب نے اپنی صفائی میں یہ مضمون لکھا اور اس کو بینات میں شائع کرنے کے لیے بھیجا گیا اور ان کو لکھا کہ جس طرح مدعی کے غلط دعاوی کو قارئین بیّنات کے سامنے پیش کیا ہے اسی طرح میرے جوابِ دعویٰ اور بیانِ صفائی کو بھی ان کے سامنے پیش فرمائیں کیوں کہ یہی عدل و انصاف اور اخلاق و قانون کا تقاضا ہے لیکن انھوں نے اس کو شائع نہ کیا۔ اور ہم اس کو "الولی" میں اس لیے شائع کر رہے ہیں تاکہ حق سامنے آجائے اور مولانا محمد طاسین صاحب کو بھی اپنی صفائی اور غلط فہمی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ازالہ کا موقعہ میسر ہو۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم المقام حضرت مدیر صاحب ماہنامہ "بیّنات"!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس عریضے کے ساتھ ایک مضمون پیشِ خدمت ہے جو مولانا محمد اسحاق صاحب کے اس مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے جو موصوف نے میری تردید و تغلیط میں لکھا اور بیّنات میں شائع ہو چکا ہے۔

میرے اس مضمون کی حیثیت اس بیانِ صفائی کی سی ہے جو ایک مدعیٰ علیہ، مدعی کے غلط دعاوی کے جواب میں پیش کرتا ہے۔ لہٰذا آپ نے جس طرح مدعی کے غلط دعاوی کو قارئین بینات کے سامنے پیش کیا ہے اسی طرح میرے جوابِ دعویٰ اور بیان صفائی کو بھی ان کے سامنے پیش فرمائیں کیوں کہ یہی عدل و انصاف اور اخلاق و قانون کا تقاضا ہے اور یہی اسلامی تعلیمات کا جن میں بلا کسی رُو رعایت ہر انسان کے ساتھ عدل و قسط کی تاکید ہے خواہ وہ دشمن اور کافر ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح علم دوستی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایک علمی بحث میں فریقین کے بیانوں کو غیرجانبداری کے ساتھ شائع کردیا جائے۔ چونکہ یہ بحث بینات میں شروع ہوئی تھی لہٰذا اس کو بینات ہی میں ختم ہونا چاہیے۔

آپ کو حق پہنچتا ہے کہ مضمون کے شروع میں جو مناسب سمجھیں ادارتی نوٹ لکھ کر شائع کریں لیکن براہِ کرم میرے اس مضمون کو ضرور شائع کریں کیوں کہ میری علمی شخصیت اور حیثیتِ عرفی کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی ممکن تلافی ہو سکے۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ میرے اس مضمون کو شائع فرما کر اپنی روایتی علم دوستی اور انصاف پروری کا ثبوت دیں گے اور مجھ پر احسان فرمائیں گے۔ احقر محمد طاسین عفی عنہ

مؤقر ماہنامہ "بیّنات" کے اگست کے شمارہ میں "مشینوں پر زکوٰۃ کا مسئلہ" کے عنوان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے مولانا محمد اسحاق صاحب کا جو مضمون، میرے اس مضمون کے جواب میں شائع ہوا ہے جو گزشتہ رمضان اور شوال کے شماروں میں شائع ہوا تھا اُسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ مولانا صاحب کو میرے اس مضمون سے زبردست دھچکا لگا اور شدید صدمہ پہنچا جو میں نے کافی ادب واحترام کے ساتھ ان کے پہلے مضمون کے جواب میں لکھا تھا۔ اور غالباً ان کے ذہن پر اتنا شدید اثر اس وجہ سے ہوا کہ وہ اپنے متعلق بھی غلط فہمی کا شکار تھے اور میرے متعلق بھی۔ اپنے متعلق وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ آج دنیا میں ان سے بڑا کوئی عالم ہے اور نہ عاقل، اور یہ کہ ان سے بھول کر بھی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی اور یہ کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ سو فیصد صحیح اور حرفِ آخر ہوتا ہے کس کی مجال ہے کہ وہ ان کی کسی بات پر گرفت کر سکے اور ان کی تحقیق کو غلط کہہ سکے۔ ایک طرف اپنے متعلق یہ علمی کبر وغرور اور دُوسری طرف میرے متعلق ان کی یہ رائے تھی کہ یہ بے چارہ سرحدی طالب علم کیا سمجھتا ہے اور اس کو کیا لکھنا آتا ہے یہ تو فوراً اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا کہہ کے میری ہر بات کو بے چون وچرا مان لے گا۔ اب میرا جوابی مضمون جو انھوں نے پڑھا تو اوسان خطا اور حواس باختہ ہوگئے اس لیے کہ میں نے اس میں ان کی متعدد فاحش غلطیوں کی پردہ دری کی اور قلعی کھولی تھی، خوب پیش وتاب کھانے کے بعد انھوں نے اور ان کے دُوسرے ساتھی نے جن کی فقاہت کا پردہ میں اپنے پہلے مضمون میں چاک کر چکا تھا اور جو دراصل اپنے اس ساتھی کو استعمال کر رہے اور اس کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلا رہے ہیں سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا کہ اب ہمارے پاس کوئی مثبت دلیل تو رہی نہیں جس کو ہم اپنے خیال کی تائید میں پیش کر سکیں اور اس سے پہلے جو دلائل پیش کیے ہیں ان میں سے ایک ایک کا یہ جواب دے چکا ہے لہٰذا اب جواب کا تخریبی اور منفی طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ اس کی تحریر کے ایک ایک ٹکڑے کو آگے پیچھے سے کاٹ کر اپنی طرف سے من مانے معنے اور غلط مطلب پہنا کر بات بات پر غلط غلط، نہیں سمجھا، اُلٹا سمجھا وغیرہ کا غُل مچایا جائے جیسا کہ روایتی مناظروں میں ہوا کرتا ہے۔ یہاں تک قارئین بینات کی توجہ ان کی غلطیوں سے ہٹ جائے اور وہ یہ باور کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ لاتنے بڑے مولانا صاحب پُورے زور وشور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ جو رٹ لگا رہے ہیں آخر اس میں کچھ تو صداقت ہوگی۔ چنانچہ اس زیر بحث مضمون میں انھوں نے اپنے فیصلہ کو عملی جامہ پہنایا اور تقریبًا چالیس مرتبہ میرے متعلق نہیں سمجھا، غلط سمجھا، جہالت اور نادانی وغیرہ الفاظ استعمال کیے۔ گویا یہ مضمون کیا ہے نہیں سمجھا، غلط سمجھا وغیرہ کی ایک مسلسل گردان ہے۔ غالبًا قارئین بیّنات نے اس سے پہلے ایسا مضمون پڑھا ہوگا اور نہ سُنا ہوگا۔ اس مضمون کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ علم وفہم اور دیانت وانصاف کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ ہے۔

بہرحال جہاں تک اصل مسئلے کا تعلق ہے یعنی یہ کہ کارخانوں کے مشینی سرمائے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں یہ دونوں صاحب اپنی رائے کے حق میں جو دلائل پیش کر سکتے تھے اپنے سابقہ دو مضامین میں پیش کر چکے ہیں۔ اور میں بھی اپنی رائے کے حق میں اپنے پچھلے دو مضامین میں سب دلائل پیش کر چکا اور ان کے دلائل کا جواب بھی دے چکا ہوں۔ اور میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ مفتی و قاضی کی حیثیت سے نہیں لکھا۔ لہٰذا اس کی حیثیت نہ افتاء کی ہے نہ قضا کی بلکہ ایک طالب علمانہ تحقیق اور علماء کو غور وفکر دعوت کی ہے۔ نیز میں بحمد اللہ اس حماقت میں بھی مبتلا نہیں کہ اس مسئلہ کے متعلق میری جو رائے ہے وہ قطعی اور آخری طور پر صحیح ہے۔ اسی طرح دوسری رائے کے حق میں بھی اب تک جو دلائل سامنے آئے ہیں ان کی بنا پر میں اس رائے کو بھی صحیح نہیں سمجھتا کیونکہ ان میں سے کسی دلیل سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مذکورہ سرمائے پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔ بہرکیف خوشی کی بات ہے کہ مدیر بیّنات نے اپنے ادارتی نوٹ میں ملک کے جیّد علماء کو اس مسئلہ پر کچھ لکھنے کی دعوت دی ہے۔ کیا اچھا ہو! ہم نے اب تک اس مسئلہ پہ جو کچھ لکھا ہے وہ حضرات اس کا بے لاگ تحقیقی جائزہ لیں اور جو حق سمجھیں بلا کسی رُو رعایت اس کو برملا پیش فرمائیں۔ اگر مجھ سے میری کسی بات کی وضاحت مطلوب ہو تو میں فورًا عرض کروں گا، یہ مسئلہ کسی شخص کا نہیں دین کا مسئلہ ہے لہٰذا اس کی تحقیق میں کسی کی شخصیت آڑے نہیں آنی چاہیے۔ اور نہ یہ چیز رکاوٹ بننی چاہیے کہ پہلے ہم ایک رائے دے چکے ہیں اب اگر اس کے خلاف دیں گے تو شخصی وقار مجروح ہوگا۔ میرے سامنے جب بھی کوئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے دلائل آئیں گے جن سے میری رائے کا غلط ہونا ثابت ہوتا ہو تو میں بلا کسی ہچکچاہٹ اور جھجک کے اپنی رائے سے رجوع کا اعلان کردوں گا۔

غرضیکہ میں اپنی اس مختصر تحریر میں اصل مسئلے کے متعلق کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن علامۂ دہر اور فہامۂ عصر نے اپنے تازہ مضمون میں میری جو جی بھر کر تغلیط اور تضحیک کی ہے میں سمجھتا ہوں اس کو نظرانداز کرنا اور اس پر خاموش رہنا ان کی بدخواہی کے مترادف ہوگا، کبر و غرور اور عُجب و گھمنڈ کا پارہ بہت اونچا ہوجائے گا اور کسی گہرے گڑھے میں گریں گے۔ لہذا ان کی خیرخواہی کا تقاضا ہے کہ ان کو بتلایا جائے اور اچھی طرح متنبہ کیا جائے کہ آپ کو میری ہر بات جو غلط ہی غلط نظر آئی ہے تو اس میں میرا قصور نہیں بلکہ آپ کی نظر اور نیّت کا قصور ہے، جس طرح یرقان کے مریض کو ہر شے زرد نظر آتی ہے اسی طرح آپ کو اپنی رائے کے خلاف دوسرے کی ہر بات غلط نظر آتی ہے، لہذا بطور علاج کچھ عرض خدمت ہے:-

کیا اچھا ہوتا کہ آپ اپنے اس مضمون میں سب سے پہلے اپنی ان غلطیوں کی صفائی پیش کرتے جن کا آپ نے اپنے پچھلے مضمون میں ارتکاب کیا اور میں نے اپنے سابق مضمون میں ان پر متنبہ کیا تھا۔ لیکن اس کے متعلق آپ کا ایک لفظ تک نہ لکھنا یہ بتلاتا ہے کہ آپ کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں ورنہ کیسے ممکن تھا کہ آپ جواب نہ دیتے۔ بہرحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ مولانا صاحب نے اپنی پچھلی غلطیوں کا کیوں جواب نہیں دیا۔ اس تحریر میں تو مجھے ان کی تازہ غلطیوں سے بحث کرنا ہے جو میری تغلیط و تحمیق کے سلسلہ میں ان سے سرزد ہوئی ہیں۔

اس تازہ مضمون میں اپنی چند لن ترانیوں کے بعد بیّنات کے صفحہ ۳۲ پر میرا دعویٰ اپنے الفاظ میں بیان کیا، دعویٰ تو ڈیڑھ سطر میں آگیا لیکن اس کی شرح میں مزید پانچ سطریں تحریر فرمائیں جن کی مطلق کوئی ضرورت نہ تھی، اس کے بعد میرے استدلال کی پوری عبارت کا ایک ٹکڑا خلاصہ کے نام سے نقل کیا اور پھر اس کی تغلیط اور تردید کرتے ہوئے لکھا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"جواب میں گزارش ہے کہ اول تو مولانا کا یہ اجتہاد صحیح نہیں، دوسرے اگر اس غلطی سے قطع نظر کرکے اسے تھوڑی دیر کے لیے صحیح بھی فرض کرلیا جائے تو بھی ان کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔"

اس جواب کے متعلق مجھے یہ پوچھنے کا پورا حق ہے کہ مولانا نے جزم کے طور پر جو یہ لکھا ہے کہ مولانا کا اجتہاد صحیح نہیں تو کیا اس بارے میں ان پر کوئی وحی اتری ہے جس کی وجہ سے انھوں نے بلا تردد اور قطعیت کے ساتھ میری دلیل کے غیر صحیح اور غلط ہونے کا حکم صادر فرمایا ہے؟ اگر وحی کی بات ہے تو میرے لیے خاموشی کے سوا چارۂ کار نہیں، اور اگر ایسا نہیں تو پھر میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے جس اجتہاد سے میرے اجتہاد کو غیر صحیح اور غلط بتلایا ہے وہ کیا اور کہاں ہے؟ اگر آپ یہ جواب دیں کہ چونکہ تیرا دعویٰ تیری دلیل سے ثابت نہیں ہوتا اس لیے غلط ہے تو پھر آپ کو اس کے بعد یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ

"اگر تھوڑی دیر کے لیے صحیح بھی فرض کرلیا جائے تو بھی ان کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔"

آخر کچھ ہوش ٹھکانے ہے؟ یہ طرزِ تحریر آپ کی شدید ذہنی الجھن اور پریشانی پر دلالت کرتا ہے۔

پھر آگے مبینات کے صفحہ ۴۳ پر شروع کی پانچ سطروں میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا تعلق بھی میرے استدلال کی پوری عبارت کے ایک ٹکڑے سے ہے جس کو آگے پیچھے سے کاٹ کر اس میں، مناظرانہ رد و قدح اور قیل و قال کی گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر میری وہ پوری عبارت نقل کی جاتی تو پھر نہ اس غلط مطلب کی کوئی گنجائش تھی اور نہ اس کی تغلیط و تردید کی ضرورت، لکھتے ہیں:

"تو سوال یہ ہے کہ کیا اس چیز پر زکوٰۃ واجب ہوگی جو کسی مال میں نما پیدا ہونے کا سبب ہے۔ اگر یہی مراد ہے تو یہ بداہتہً غلط ہے مویشی میں اسامت اور اموالِ تجارت میں تجارت سببِ نما ہے لیکن اسامت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

و تجارت کسی مال کا نام نہیں بلکہ افعال ہیں، تو کیا اموال کی طرح شرعاً افعال پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ اس کا تو کوئی عاقل تصور بھی نہیں کرسکتا"

جواباً عرض ہے کہ اور کوئی عاقل اس کا تصور کرسکتا ہو یا نہ کرسکتا ہو لیکن آپ اس کا ضرور تصور کرسکتے ہیں اگر تصور نہ کیا ہوتا تو آپ لکھتے کیسے؟ لیکن جہانتک میرا تعلق ہے میں اس بداہتہً غلط بات کا کبھی بھول کر بھی تصور نہیں کرسکتا، اس کا ثبوت میری وہ عبارت ہے جو آپ کے نقل کردہ ٹکڑے سے دو سطریں پہلے ہے اور وہ یہ:

"دوسری بات یہ کہ وجوبِ زکوٰۃ کا اصل تعلق تو اس مال سے ہے جس کو نما اور بڑھنے کے لیے تیار کیا گیا ہو، تجارت اور اسامت چونکہ مال میں نما پیدا ہونے کا سبب ہیں لہذا نما کا سبب ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ وجوبِ زکوٰۃ کا تعلق قائم کردیا گیا ہے۔"

بتلائیے اِس عبارت کے ہوتے ہوئے اُس ہرزہ سرائی کی گنجائش رہتی ہے جو ان پانچ سطروں میں منطقیانہ اگر مگر سے کی گئی ہے۔ اس سے اس انصاف و دیانت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے جس کو یہ جواب لکھنے میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ قارئینِ بیّنات سے درخواست ہے کہ وہ براہِ کرم بیّنات کے رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ کے شمارہ میں صفحہ ۴۳ پر میری تحریر ملاحظہ فرمائیں، مذکورہ حقیقت ان کے سامنے آجائے گی اور میری بات کی تصدیق ہوجائے گی کہ مولانا صاحب کا مقصد ہر جائز و ناجائز طریقہ سے میری تغلیط اور تضحیک کرنا ہے۔

اس کے بعد سطر نمبر ۶ سے ۱۲ تک جو کچھ لکھا ہے اس میں میرے سیدھے سادھے مطلب کو اگر مگر کے منطقی چکر سے اُلجھا کر بگاڑنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ آخر میں جاکر میرے متعلق یہ کہہ سکیں کہ وہ (نادان) ان دونوں باتوں کا فرق نہیں ملحوظ رکھ سکا۔ میں پہلے ان کی عبارت نقل کرتا ہوں پھر اپنا وہ مطلب عرض کروں گا جو اپنے پچھلے دو مضامین میں نہایت واضح طور پر لکھ چکا ہوں۔ مولانا کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"اگر مراد یہ ہے کہ جس مال میں اس کے سبب سے نما پیدا ہوا ہے اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی یعنی جس مال کی تجارت کی جاتی ہے یا جن حیوانات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اسامت پائی جاتی ہے ان کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے تو صحیح ہے لیکن اس صورت میں دلیل دعوے پر منطبق نہیں ہوتی۔ مثال مذکور میں شکر تیار کرنے والی مشینیں شکر میں نما کا سبب بنتی ہے، مولانا کی دلیل سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ شکر کی زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے مگر اس سے انکار کسے ہے؟ شکر مال تجارت ہے اس پر بالاتفاق زکوٰۃ ہے، مسئلہ تو شکر تیار کرنے والی مشین کا ہے، مولانا کی دلیل سے اس پر زکوٰۃ کا وجوب کسی طرح ثابت نہیں ہوتا وہ ان دونوں باتوں کا فرق نہیں ملحوظ رکھ سکے۔"

اس کے بعد اب میرا وہ مطلب سنیئے جو میں اپنے سابقہ دو مضامین میں واشگاف طور پر عرض کر چکا ہوں، اور وہ یہ کہ حنفی فقہاء نے مال نامی کا جو فقہی مفہوم و مطلب بیان کیا ہے اور پھر مالِ تجارت اور سائمہ جانوروں پر زکوٰۃ واجب ہونے کی جو وجہ بیان کی ہے اس کی رُو سے ہر اس مال پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے جس کو بڑھانے کی غرض سے کسی ایسے کاروباری طریقے سے وابستہ کر دیا گیا ہو جس سے عموماً مال بڑھتا اور نما پاتا ہے (جیسے تجارت، اسامت اور کارخانہ داری وغیرہ کا طریقہ) اور یہ کہ اس کے مطابق اس مال پر بھی زکوٰۃ عائد ہوتی ہے جس سے ایک کارخانہ لگایا جاتا ہے اور یہ کہ کارخانے کی مشینوں پر مالیت کے لحاظ سے اسی طرح اور انھی شرائط کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جس طرح دوسرے کسی تجارتی ساز و سامان پر بلحاظ مالیت واجب ہوتی ہے۔ میں نے کہیں یہ نہیں کہا کہ مشین نما کا سبب بنتی ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ کارخانہ داری کا کاروباری طریقہ نما کا سبب بنتا ہے اور دونوں باتوں میں کھلا ہوا فرق ہے کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو دوسری بات ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک مولانا کی یہ تعبیر غلط اور میری مراد کے بالکل خلاف ہے کہ شکر تیار کرنے والی مشین شکر میں نما کا سبب بنتی ہے کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شکر کچھ تو پہلے سے موجود ہے اور مشین اس میں نما اور زیادتی کا سبب بنتی ہے، اور یہ مطلب بداہۃً اور مشاہدۃً غلط ہے، پتہ نہیں مولانا نے کس بے ہوشی کی حالت میں ایسا لکھ دیا جسے کوئی ہوشمند آدمی نہیں لکھ سکتا۔ اور پھر تعجب ہے کہ مولانا نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی مذکورہ عبارت کے بعد میری جو تحریر رد کرنے کی غرض سے نقل کی ہے وہ تحریر صاف بتلا رہی ہے کہ میں انڈسٹری کے کاروبار کو سرمائے اور راس المال میں نما کا سبب مانتا ہوں نہ کہ مشینوں کو۔ آخر کسی کی مخالفت میں ایسا اندھا بھی تو نہ ہو جانا چاہیے کہ اس کو آگے پیچھے کچھ نظر نہ آئے۔

پھر آگے میرے استدلال کی عبارت کا ضروری حصہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> "مولانا اس تحریر میں متعدد باتیں قابل نظر ہیں۔ اول: فقہ سے معمولی تعلق رکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ تجارت میں لگے ہوئے سرمائے پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے زکوٰۃ مال تجارت پر فرض ہوتی ہے نہ کہ تجارت میں لگے ہوئے سرمائے پر الخ"

اس تحریر میں مولانا صاحب نے خواہ مخواہ میری ایک بدیہی بات کو اپنی خاص نظر سے نظری بنا دیا ہے تاکہ ان کو میری تغلیط کا موقع مل سکے ورنہ جو معاشیات کی الف بات واقف ہو وہ بھی جانتا ہے کہ جس طرح اس نقدی کو سرمایہ کہا جاتا ہے جس سے سامانِ تجارت خریدا جاتا ہے اسی طرح اس خریدے ہوئے سامان تجارت کو بھی سرمایہ کہا جاتا ہے جس کو فروخت کرنے کی غرض سے ایک تاجر اپنے پاس جمع رکھتا ہے، اسی سامان تجارت کو دوسرے الفاظ میں مالِ تجارت اور عروضِ تجارت بھی کہا جاتا ہے۔ مولانا صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سرمایہ صرف اس نقدی ہی کا نام ہے جس سے مالِ تجارت خریدا جاتا ہے اُس مال کا نام نہیں جس کے ساتھ تاجر محنت کر کے نفع کماتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے یہ لکھ دیا کہ

> "تجارت میں لگے ہوئے سرمائے پر کوئی زکوٰۃ نہیں ہے زکوٰۃ مالِ تجارت پر فرض ہوتی ہے۔"

اور پھر ان سے کوئی یہ پوچھے کہ جب دس ہزار روپے کے سرمائے سے ایک تاجر نے تجارت کے لیے کپڑا خرید لیا تو ظاہر ہے کہ اب اس کے پاس وہ سرمایہ تو نہ رہا، نقد دس ہزار کے بجائے اب اس کے پاس دس ہزار کا کپڑا ہے جس کو آپ مالِ تجارت کہتے ہیں اور آپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور میں دونوں اس پر وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں، تو جب نقد سرمایہ اس کے پاس نہ رہا تو اس سرمائے پر زکوٰۃ واجب ہونے کے کیا معنیٰ؟ مطلب یہ کہ جو چیز کسی کے پاس موجود ہی نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہونے کا کوئی جاہل سے جاہل بھی تصور نہیں کرسکتا۔ اور کیا آپ میری تحریر سے کوئی ثبوت پیش کرسکتے ہیں کہ میں اصل نقد سرمائے پر بھی وجوب زکوٰۃ کا قائل ہوں اور مال تجارت اور عروض تجارت پر بھی وجوب زکوٰۃ کا قائل، یعنی جس دس ہزار کا تاجر نے کپڑا خریدا تھا ایک سال کے بعد اس پر بھی ڈھائی فیصد زکوٰۃ ہے اور جو کپڑا پڑا ہوا ہے اس پر بھی بلحاظ مالیت وقیمت ڈھائی فیصد زکوٰۃ ہے۔ میں تو اس کا کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا چہ جائیکہ اسے لکھوں۔ یہ بات محض آپ کے ذہن کی پیداوار ہے مجھ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

باقی اس بات کو فقہ کا ایک معمولی طالب علم جس نے قدوری پڑھی ہو جانتا ہے کہ عروض تجارت اور سامان تجارت پر جو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ ان کی مالیت اور قیمت کے اعتبار سے ہوتی ہے یعنی جب عروض تجارت اپنی مالیت اور قیمت کے لحاظ سے سونے یا چاندی کے نصاب کے برابر ہوں اور سال گزر گیا ہو تو نقد قیمت کے لحاظ سے اُن پر اڑھائی فیصد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور صرف منافع پر نہیں بلکہ اس مال تجارت پر بھی واجب ہوتی ہے جس پر سال گزر گیا ہو۔ مطلب یہ کہ ایک تاجر نے دس ہزار روپے کا کپڑا خریدا اور سال بھر اس کو بیچتا رہا، سال کے بعد اس نے حساب کیا تو معلوم ہوا کہ فروخت سے جو نقد رقم وصول ہوئی ہے اور نیز دکان میں جو بچا ہوا کپڑا ہے اس کی قیمت ملا کر کل پندرہ ہزار روپے ہوجاتے ہیں تو اس پر زکوٰۃ صرف منافع کے پانچ ہزار کی نہیں ہوتی بلکہ پورے پندرہ ہزار کی ہوتی ہے۔ اگر مولانا کو یہ مسئلہ یاد نہ رہا ہو تو ایک مرتبہ پھر فقہ کی کوئی کتاب پڑھنے کی زحمت فرمائیں۔

قارئین کرام! میں نے یہاں تک جو کچھ لکھا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا کی وہ قیل وقال پڑھیے جو انھوں نے اوّل، دوم اور سوم کی گنتی کے ساتھ دو صفحوں میں تحریر فرمائی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ سب غلط فہمیوں اور غلط مفروضوں پر مبنی ہے، جس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنیاد پر رد و قدح کا یہ محل کھڑا کیا گیا ہے وہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ جن باتوں کا میں قائل ہی نہیں اور جن کا غلط ہونا خود میری تحریروں سے ظاہر ہے ان کو میری طرف منسوب کرکے غلطیوں کی بوچھاڑ کی گئی ہے۔

نمبر سوم کے بعد مولانا کے اس جوابی مضمون کا جو حصہ ہے وہ عجوبۂ روزگار اور دنیا میں اپنی مثال آپ ہے، جس کو "بینات" کے صفحہ ۳۶ پر جلی حروف سے غلط فہمیاں کی بغلی سرخی کے عنوان سے تحریر فرمایا گیا ہے اور بڑے اہتمام سے نمبروار وہ غلط فہمیاں شمار فرمائی گئی ہیں جو ان کے فہم فاسد کے مطابق بدائع الصنائع کی عبارتوں کو سمجھنے میں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں۔ بلکہ کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس مضمون کا مرکزی حصہ یہی ہے اور اسی کے لیے یہ مضمون لکھا لکھوایا گیا ہے۔ اور مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ میری ان غلط فہمیوں کو دریافت کرنے کا سہرا حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب کے سر ہے انھوں نے اپنی اعلیٰ ذہانت اور بے مثال فقاہت کے زور سے میری یہ غلطیاں پکڑیں اور پھر اپنے ساتھی حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب صدیقی وسندیلوی کی جھولی میں ڈالی ہیں کہ لو ان کو خوب اچھالو اور اس شخص کے علم و فہم کا مضحکہ اڑا کر خوب بدنام کرو تاکہ آئندہ یہ کبھی ہمارے مقابلے میں لکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ جو گڑھا ہم دوسرے کے لیے کھود رہے ہیں اس میں خود گریں گے۔ اللہ کریم بری نیت والوں کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دیتا ہے خصوصاً ان کو جو دین کے نام پر دین کے خلاف کرتے ہیں۔

علمائے کرام کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش ہے کہ اگر آپ کے پاس کتاب بدائع الصنائع موجود ہے تو اس کی جلد دوم کے صفحہ گیارہ کی وہ عبارت جو سطر نمبر ۵ سے شروع ہوتی ہے، اس کو سطر نمبر ۱۴ تک غور سے پڑھیں اور پھر دیکھیں کہ اس عبارت کا جو مطلب میں نے سمجھا ہے وہ غلط ہے یا جو انھوں نے سمجھا ہے وہ غلط ہے۔ میرے مطلب کو بینات کے شمارہ رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ کے صفحہ ۴۱ سے ۵۰ تک دیکھا جائے۔ یہاں میں اس کا صرف اتنا حصہ نقل کروں گا جس کو انھوں نے غلط بتلایا ہے۔

چونکہ کتاب بدائع الصنائع ہر عالم کے پاس نہیں ہوتی لہذا میں یہاں اس کا وہ حصہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس کے مطلب کے متعلق ہمارے درمیان اختلاف ہے :-

ومنها كون المال ناميا لان معنى الزكوٰة وهو النماء لا يحصل الا من المال النامي ولسنا نعني به حقيقة النماء لان ذلك غير معتبر وانما نعني به كون المال معدا للاستنماء بالتجارة او بالاسامة ؛ لان الاسامة سبب لحصول الدر والنسل والسمن، والتجارة سبب لحصول الربح فيقام السبب مقام المسبب وتعلق الحكم به كالسفر مع المشقة والنكاح مع الوطء والنوم مع الحدث ونحو ذلك، وان شئت قلت ومنها كون المال فاضلا عن الحاجة الاصلية لان به يتحقق الغناء ومعنى النعمة وهو التنعم وبه يحصل الاداء عن طيب النفس، اذ المال المحتاج اليه حاجة اصلية لا يكون صاحبه غنيا عنه ولا يكون نعمة اذ التنعم لا يحصل بالقدر المحتاج اليه حاجة اصلية لانه من ضروريات حاجة البقاء و قوام البدن فكان شكره شكر نعمة البدن ولا يحصل الاداء عن طيب النفس فلا يقع الاداء بالجهة المامور بها لقوله صلى الله عليه وسلم واذوا زكوٰة اموالكم طيبة بها انفسكم فلا تقع زكوٰة لا حقيقة الحاجة امر باطن لا يوقف عليه فلا يعرف الفضل عن الحاجة فيقام دليل الفضل عن الحاجة مقامه وهو الاعداد للاسامة والتجارة وهذا قول عامة العلماء وقال مالك هذا ليس بشرط لوجوب الزكوٰة وتجب الزكوٰة في كل مال سواء كان ناميا فاضلا عن الحاجة الاصلية اولا كثياب البذلة والمهنة والعلوفة والحمولة والعمولة من المواشي وعبيد الخدمة والمساكن والمراكب وكسوة الاهل وطعامهم وما يتجمل به من آنية او لؤلؤ او فرش ومتاع لم ينو به التجارة ونحو ذلك.

ولنا ان معنى النماء والفضل عن الحاجة الاصلية لا بد منه لوجوب الزكوٰة لما ذكرنا من الدلائل ولا يتحقق ذلك في هذه الاموال وبه تبين ان المراد من العمومات : الاموال النامية الفاضلة عن الحوائج الاصلية.

"بدائع الصنائع" کی اس عبارت میں [illegible] تفصیل [illegible] وہ میرے گزشتہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مضمون میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس میں ذکر کردہ میرے جن مطالب کو ان حضرات نے غلط بتلایا ہے یہاں مجھے خاص طور سے ان پر بحث کرنا ہے۔

میرے جن مطالب کو ان حضرات نے غلط بتلایا ہے ان میں سے ایک یہ کہ میں نے کون المال فاضلا عن الحاجۃ الاصلیۃ اور کون المال نامیا کو ایک ہی شرط سمجھا اور ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں، تفسیریں اور تعریفیں قرار دیا ہے، حالانکہ ان کی سمجھ میں یہ دو الگ الگ شرطیں اور دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ صفحہ ۳۶ سطر ۱۲ تا ۱۵ میں میرے مطلب کی تغلیط کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ کھلی ہوئی غلطی نتیجہ ہے اس بات کا کہ مولانا "بدائع" کی عبارت مذکورہ کو بالکل نہیں سمجھ سکے۔ اس عبارت میں علامہ کاسانی نے وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط بیان فرمائی ہے کہ مال کا حاجت اصلیہ سے زائد ہونا بھی وجوب زکوٰۃ کے لیے ضروری ہے جو مال حاجتِ اصلیہ سے زائد نہ ہوگا اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔"

اس کے بعد پھر صفحہ ۳۷ پر غلطی (۴) کا نمبر لگا کر لکھتے ہیں:

"بدائع" کی تین عبارتیں انھوں نے نقل فرمائی ہیں اور تینوں کا مطلب انھوں نے غلط بیان فرمایا، ان تینوں میں وجوب زکوٰۃ کے شرائط میں سے دو شرطیں بیان کی گئی ہیں: اول مال کا نامی ہونا، دوم اس کا حاجتِ اصلیہ سے زائد ہونا۔ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں مگر مولانا حاجتِ اصلیہ سے فاضل ہونے کو مال نامی کی تعریف قرار دے رہے ہیں جو بالکل غلط ہے عبارت مذکور جس شخص کا جی چاہے دیکھ لے مولانا کی یہ کھلی ہوئی غلطی اول نظر میں گرفت میں آجائے گی۔"

• آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان مذکورہ دو عبارتوں میں نہایت واضح طور پر اور بڑے معصومانہ انداز سے اور قطعیت کے ساتھ میرے مطلب کو غلط اور اپنے مطلب کو صحیح بتلایا اور ساتھ ساتھ مجھ پر نافہمی و ناسمجھی کے فقرے بھی چست کیے گئے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ حقیقت اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برعکس ہے، اور الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والا مضمون ہے۔

چونکہ ان مولانا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں بدائع کی ان عبارتوں پر دوبارہ نظر ڈالوں تو مجھ پر میری غلط فہمی آشکارہ ہوجائے گی لہذا میں نے مولانا کے ارشاد کی تعمیل میں ان عبارتوں کو دس مرتبہ دیکھا اور سرسری و سطحی نظر سے نہیں بلکہ عمیق اور گہری نظر سے ان کا مطالعہ کیا اور جائزہ لیا تو مجھے سو فیصد یقین ہوگیا کہ جو مطلب میں نے سمجھا وہ صحیح اور جو انھوں نے سمجھا وہ قطعاً غلط ہے۔ پھر میں نے متعدد علماء کو بدائع کی مذکورہ عبارتیں دکھائیں اور ان سے عرض کیا کہ آپ انصاف کے ساتھ بتائیں کہ ان عبارتوں کا مطلب جو میں نے سمجھا وہ صحیح ہے یا جو انھوں نے سمجھا وہ صحیح ہے، تو انھوں نے میرے مطلب کو صحیح بتلایا، ان کے مطلب کو غلط۔ لیکن محض دعویٰ کافی نہیں اس کے ثبوت میں دلائل ہونے چاہئیں، سو وہ یہ ہیں:

اول یہ کہ اگر کون المال فاضلا عن الحاجۃ الاصلیہ وجوب زکوٰۃ کے لیے کون المال نامیا کے علاوہ ایک مستقل شرط ہوتی تو پھر ان شئت قلت سے اس کو بیان نہ کیا جاتا بلکہ جس طرح دوسری شرطوں کو صرف منہا سے بیان کیا گیا ہے اسی طرح اس کو بھی صرف منہا سے بیان کیا جاتا۔

دوم یہ کہ جو شخص عربی زبان اور اس کے اسالیب بیان سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو وہ بخوبی جانتا ہے کہ اِن شِئتَ قلتَ کے بعد جو بات بیان کی جاتی ہے وہ اسی بات کی دوسری تعبیر ہوتی ہے جو ان شئت قلتَ سے پہلے بیان کی گئی تھی۔ دراصل ایک مصنف کسی مطلب کو خاص الفاظ سے بیان کرنے کے بعد جب یہ چاہتا ہے کہ اس کو زیادہ واضح اور بہتر الفاظ سے دوبارہ بیان کرے تو وہ درمیان میں اِن شِئتَ قُلتَ قسم کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ ایک ایسی واضح بات ہے جس کا کوئی لکھا پڑھا آدمی انکار نہیں کرسکتا۔ لہذا اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ علامہ کاسانی نے کون المال نامیا کے بعد ان شئت قلت لکھ کر کون المال فاضلا عن الحاجۃ الاصلیۃ جو تحریر فرمایا ہے تو یہ وجوب زکوٰۃ کی کوئی الگ شرط نہیں ہے بلکہ ایک ہی شرط کی دوسری تعبیر و تفسیر ہے۔ واضح رہے کہ میں نے تعبیر و تفسیر کے بعد جو تعریف کا لفظ استعمال کیا ہے وہ تعریف بمعنی اصطلاحی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں جو جنس وفصل وغیرہ سے کی جاتی ہے اور اس میں جامعیت ومانعیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے کیونکہ اس طرح تو خود کون المال معداً للاستنماء بھی مال نامی کی منطقی تعریف نہیں لیکن تعجب اس ذہنیت پر ہے کہ میرے تعبیر وتفسیر کے لفظ کو نظر انداز کرکے صرف تعریف کے لفظ کو لے کر ردّ وقدح شروع کر دیا گیا اور طنزاً یہ کہا گیا کہ

"یہ تعریف فقہ کے کسی طالب علم نے نہ کسی کتاب میں دیکھی ہو گی اور نہ سُنی ہو گی"

گویا ان کے نزدیک بدائع الصنائع فقہ کی کتاب نہیں، سبحان اللہ کیا صلاح وتقویٰ ہے۔

تیسری دلیل بدائع کے اسی صفحہ پر تین عبارتیں ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ کاسانی کے نزدیک کون المال نامیا اور کون المال فاضلا عن الحاجۃ الاصلیۃ دو الگ الگ شرطیں نہیں بلکہ ایک ہی شرط کی دو تعبیریں ہیں، وہ عبارتیں یہ ہیں:

(۱) وقال مالک ھذا لیس بشرط لوجوب الزکوٰۃ، وتجب الزکوٰۃ فی کل مال سواء کان نامیا فاضلا عن الحاجۃ الاصلیۃ او لا۔

(۲) وبہ تبین ان المراد من العمومات الاموال النامیۃ الفاضلۃ عن الحوائج الاصلیۃ۔

پہلی عبارت میں نامیا فاضلا اور دوسری عبارت میں النامیۃ الفاضلۃ کو بغیر واؤ عطف کے ذکر کیا گیا ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان دونوں کے معنیٰ ومطلب میں کوئی مغایرت نہیں۔ اگر مغایرت ہوتی تو ان کے درمیان واؤ عطف کا ذکر کرنا ضروری تھا، بالفاظ دیگر اگر اپنے معنیٰ ومطلب کے لحاظ سے یہ دو الگ الگ شرطیں ہوتیں تو ان کے درمیان مغایرت ظاہر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ نامیا وفاضلا اور النامیۃ والفاضلۃ لکھا جاتا کیونکہ حرف عطف، معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغایرت پر دلالت کرتا ہے جیسے کہ حرف عطف کا نہ ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ دونوں ایک شرط اور متحد الحقیقت چیز ہیں۔

تیسری عبارت یہ ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ولنا ان معنی النماء والفضل عن الحاجۃ الاصلیۃ لابد منہ لوجوب الزکوۃ۔

اس عبارت میں لفظ منہ کی جو ضمیر واحد ہے وہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ علامہ کاسانی کے نزدیک "نما" اور "فضل عن الحاجہ" ایک چیز اور ایک شرط ہیں کیونکہ اگر یہ دو چیزیں اور دو الگ الگ شرطیں ہوتیں تو منہ کے بجائے ضمیر تثنیہ کے ساتھ منہما لکھا جاتا۔

چوتھی دلیل اس پر کہ مال کا نامی ہونا اور فاضل عن الحاجہ ہونا ایک چیز اور ایک شرط ہے یہ ہے کہ ان دونوں کا مصداق ایک ہے۔ تجارت میں لگے ہوئے مال اور سائمہ مویشیوں پر جس طرح مال نامی صادق آتا ہے ٹھیک اسی طرح مال فاضل عن الحاجہ بھی صادق آتا ہے، اسی طرح اس کے برعکس ایک ہی مال پر "مشغول بالحاجۃ الاصلیہ" اور "غیر نامی" یکساں طور پہ صادق آتا ہے جیسے ذاتی استعمال میں لگا ہوا سامان، کہ اس پر مشغول بالحاجۃ الاصلیہ بھی صادق آتا ہے اور غیر نامی بھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی کے متعدد متون میں وجوب زکوٰۃ کی جو قیود و شروط ذکر کی گئی ہیں ان میں بعض چوٹی کے فقہاء نے "نامی" کے بجائے "فاضل عن حاجۃ الاصلیہ" پر اکتفاء کیا ہے۔ مثلاً "الوقایہ" میں زکوٰۃ کے متعلق لکھا ہے:

"ھی لا تجب الّا فی نصاب حولی فاضلا عن حاجتہ الاصلیۃ مملوك ملکًا تامًّا علی حرّ مکلّف مسلم۔"

اور "المختار" کے الفاظ یہ ہیں:

"ولا تجب الّا علی الحر المسلم العاقل البالغ اذا ملك نصابًا خالیًا عن الدین فاضلًا عن حوائجہ الاصلیۃ ملکًا تامًّا فی طرفی الحول۔"

"مختصر القدوری" میں بھی نامی کا لفظ نہیں ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے:

"الزکوٰۃ واجبۃ علی الحر المسلم البالغ العاقل اذا ملك نصابًا کاملًا ملکًا تامًّا وحال علیہ الحول۔"

البتہ آگے چل کر اس نے ان چیزوں سے زکوٰۃ کی نفی کی ہے جو مشغول بالحاجۃ الاصلیہ ہوتی ہیں۔

قارئینِ کرام! آپ نے دیکھ لیا کہ مذکورہ دلائل سے مولانا اسحاق صاحب کا سمجھا ہوا مطلب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غلط اور میرا مطلب صحیح ثابت ہوتا ہے لہٰذا ان غلطیوں کی بوچھاڑ ان پر ہوتی ہے جن کی انہوں نے اس بارے میں مجھ پر کی ہے۔

غلط فہمی ۱ اور ۴ کا منہ توڑ جواب ہو چکنے کے بعد اب میری غلط فہمی ۲ کو لیجیے جس میں لکھتے ہیں:

> (۲) "ھذا قول عامۃ العلماء کا مطلب بھی مولانا نے غلط سمجھا، یہاں اشارہ اس طرف ہے کہ "نما" کی شرط تمام علماء یعنی احناف، شوافع، حنابلہ سب کا قول ہے، اس کے بعد امام مالک کا قول ذکر کیا ہے کہ ان کے نزدیک نما شرط نہیں، مولانا نے ھذا کا مرجع اپنی خود ساختہ تعریف مال نامی کو قرار دیا ہے جو علامہ کاسانی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی۔"

اس تحریر کے متعلق میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ کوئی ہوشمند اور صحیح الفہم عالم یہ نہیں لکھ سکتا۔ کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ان مولانا نے گویا قسم کھا رکھی ہے کہ وہ میری صحیح سے صحیح بات کو بھی ضرور غلط کہیں گے خواہ اس میں ان کو کتنی ہی بدفہمی کا ارتکاب کیوں نہ کرنا پڑے۔ لہٰذا انھوں نے اس تحریر میں نہ صرف یہ کہ میری بالکل صحیح بات کو غلط لکھا ہے بلکہ تمام شافعی اور حنبلی فقہاء پر بھی جھوٹ باندھا ہے کیونکہ شافعی اور حنبلی فقہ کی کتابوں میں یہ مذکور نہیں کہ شرائطِ وجوب زکوٰۃ میں سے ایک شرط مال کا نامی ہونا بھی ہے جس طرح حنفی فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ میں اپنے پچھلے مضمون میں بھی یہ بات لکھ چکا تھا، اگر میری وہ بات غلط تھی تو مولانا کو اس کے ثبوت میں فقہ شافعی اور حنبلی کی کتابوں سے وہ عبارتیں پیش کرنی چاہیے تھیں جن میں یہ ذکر ہوتا کہ ان کے نزدیک مال پر زکوٰۃ واجب ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ مال نامی ہو۔ ادھر میں نے جو بات لکھی ہے فقہ شافعی و حنبلی کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں دیکھنے کے بعد لکھی ہے، البتہ ان کتابوں سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ جو مالی حوائج اصلیہ میں مشغول ہو اس پر زکوٰۃ نہیں۔ لہٰذا بدائع کی مذکورہ عبارت میں ھذا قول عامۃ العلماء کا اشارہ کون المال فاضلاً عن الحاجۃ الاصلیۃ ہی کی طرف ہو سکتا ہے کون المال نامیاً کی طرف نہیں ہو سکتا۔ اور پھر جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے مطلب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مصداق کے لحاظ سے یہ دونوں تعبیریں ایک شرط ہیں دو الگ الگ شرطیں نہیں، لہٰذا کون المال فاضلا عن الحاجۃ الاصلیۃ کی طرف اشارہ اور کون المال نامیا کی طرف اشارہ ایک ہی چیز ہے، لیکن چونکہ فقہ شافعی وحنبلی میں کون المال نامیا کی شرط موجود نہیں لہذا ھٰذا کا مشار الیہ صرف کون المال فاضلا عن الحاجۃ الاصلیۃ ہی ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد غلط فہمی ۳ میں جو کچھ لکھا ہے وہ جس طرح کج فہمی پر دلالت کرتا ہے اسی طرح علمی بددیانتی اور عیاری کا بھی اچھا خاصا نمونہ ہے۔ دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ بدائع کی وہ عبارت جس سے مشینوں کے مال تجارت ہونے پر استدلال کیا ہے اور میری وہ اصل عبارت جو اس استدلال پر مشتمل ہے مولانا ان دونوں عبارتوں کو من وعن ذکر کرتے اور پھر یہ بتلاتے کہ مجھ سے استدلال میں جو غلطی ہوئی ہے وہ کیا ہے لیکن انھوں نے بدائع کی اور میری اصل عبارت کو سامنے تک نہیں آنے دیا بلکہ اس کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اس پر دل کی بھڑاس نکالنی شروع کر دی اور چند سطور میں آٹھ مرتبہ غلط، غلطی، نافہمی اور باطل وغیرہ الفاظ استعمال کیے۔ گویا ان الفاظ کے سوا ان کے ذہن میں اور کچھ ہے ہی نہیں۔ بہرحال قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ براہِ کرم میرے مضمون کے اس حصہ کو پڑھیں جس پر مولانا نے ۳ میں رد لکھا ہے اور پھر یہ دیکھیں کہ میں نے کس طریقے سے کیا بات لکھی ہے اور مولانا صاحب نے اس کو کیا سمجھ کر کیا لکھا ہے۔ میرے خیال میں مناسب ہوگا کہ یہاں بدائع الصنائع کی وہ پوری عبارت نقل کی جائے اور پھر اپنے استدلال کا خلاصہ، تاکہ جن کے پاس میرا پچھلا مضمون نہیں وہ اسی سے حقیقت حال کا اندازہ لگا سکیں، بدائع کی عبارت یہ ہے:

"الا ان الاعداد للتجارۃ فی الاثمان المطلقۃ من الذھب والفضۃ ثابت باصل الخلقۃ لانہا لا تصلح للانتفاع باعیانہا فی دفع الحوائج الاصلیۃ فلا حاجۃ الی الاعداد من العبد للتجارۃ بالنیۃ، اذ النیۃ للتعیین وھی متعینۃ للتجارۃ باصل الخلقۃ فلا حاجۃ الی التعیین بالنیۃ فتجب الزکوٰۃ فیہا نوی التجارۃ او لم ینو اصلا او نوی النفقۃ، واما فیما سوی الاثمان من العروض فانما یکون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الاعداد فیھا للتجارۃ بالنیۃ لانھا کما تصلح للتجارۃ تصلح للانتفاع باعیانھا بل المقصود الاصلی منھا ذلک فلابد من التعیین للتجارۃ وذلک بالنیۃ۔"

(صفحہ ۱۱ - بدائع الصنائع - جلد دوم)

اس عبارت کے جو خط کشیدہ حصے ہیں میرے استدلال کا تعلق ان سے ہے لیکن مولانا نے عمداً ان کو ذکر نہیں کیا، اسی طرح میرے استدلال کی عبارت کا جو اصل حصہ تھا اس کو بھی نگاہوں سے اوجھل رکھا تاکہ ان کی تردید و تغلیط کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو اور وہ بآسانی دھوکا دے سکیں۔

علامہ کاسانی ؒ نے مذکورہ عبارت میں جو بات بیان فرمائی ہے وہ یہ کہ اثمان مطلقہ یعنی سونے چاندی اور زر و نقدی پر ہر حال میں زکوٰۃ ہے ان کے مالک کی ان کے متعلق تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو کیونکہ وہ خلقی طور پر تجارت کے لیے متعین ہیں اور سونے چاندی کے سوا جو دوسری اس قسم کی اشیاء ہیں جن کو بعینہٖ استعمال کرکے انسان ان سے اپنی طبعی حاجات میں سے کسی حاجت کو پورا کرتا ہے جیسے کھانے پینے پہننے پوشنے وغیرہ کی اشیاء، اور جن کو فقہ کی زبان میں عروض قنیہ اور معاشیات کی زبان میں اشیائے صَرف و استعمال کہا جاتا ہے ان پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب ان کے متعلق تجارت کی نیت ہو، پھر اسی عبارت میں علامہ ممدوح نے مذکورہ بات کی عقلی توجیہ و تعلیل بیان فرمائی ہے یعنی یہ کہ کیا وجہ ہے کہ سونے چاندی کے مال تجارت بننے کے لیے نیت تجارت کی ضرورت نہیں اور عروض قنیہ کے مال تجارت بننے کے لیے نیت تجارت کی ضرورت ہے اور وہ عقلی توجیہ و تعلیل اس طرح فرمائی کہ نیت اس بات کی تعیین کے لیے ہوتی ہے کہ یہ مال مالک کی ذاتی ضروریات و حاجات میں خرچ کرنے کے لیے نہیں بلکہ تجارت اور کمانے کے لیے ہے۔ لہٰذا جس مال میں مذکورہ دو احتمال ہو سکتے ہوں اس کو برائے تجارت متعین کرنے کے لیے نیت تجارت کا ہونا عقل کی رو سے ضروری ہے۔ اور جس مال میں مذکورہ دو باتوں کا احتمال ہی نہ ہو بلکہ وہ محض تجارت کے لیے متعین ہو اس کے متعلق نیت تجارت کی نہ ضرورت ہے اور نہ اس کا کچھ فائدہ بلکہ تحصیلِ حاصل کے مترادف ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور چونکہ سونا اور چاندی ایسی چیزیں ہیں، جن میں سرے سے یہ صلاحیت ہی نہیں کہ ان کو بعینہٖ استعمال کر کے ان سے طبعی حاجات پوراکرنے میں فائدہ اٹھایاجاسکے جیساکہ کھانے پینے پہننے پوشنے اور رہنے سہنے وغیرہ کی چیزوں سے فائدہ اٹھایاجاتاہے بلکہ وہ اس کے لیے متعین ہیں کہ ان سے سکے وغیرہ بناکر ان کے ذریعے آپس میں تبادلۂ اشیاء کاکام لیا جائے جس کا نام تجارت ہے لہذا وہ اپنی بناوٹ وساخت کے لحاظ سے تجارت کے لیے متعین ہیں، ان کے لیے تجارت کی نیت ہونا نہ ہونا برابر ہے لہذا ان کو مال تجارت بنانے کے لیے نیت تجارت کی کوئی ضرورت نہیں، بخلاف عروض قنیہ اور اشیاء صرف کے کہ ان میں دونوں باتوں کی صلاحیت ہوتی ہے مالک کی ذاتی ضروریات کے لیے بھی مخصوص ہوسکتی ہیں اور اموال تجارت بھی بن سکتی ہیں لہذا ان کو مال تجارت بنانے کے لیے نیت تجارت کا وجود عقلاً ضروری ہے تاکہ وہ تجارت کیلئے متعین ہوجائیں۔

میں نے اس مذکورہ توجیہ وتعلیل سے یہ استدلال کیا ہے کہ چونکہ کارخانوں کی مشینری نہ تو عروض قنیہ اور اشیائے صرف میں آتی ہے اور نہ سونے چاندی کے تحت، بلکہ یہ مال کی ایک نئی تیسری قسم ہے جو تقریباً صدی ڈیڑھ صدی پہلے وجود میں آئی جب یورپ وغیرہ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا اور جو آج انسان کے تموّل کا اسی طرح ذریعہ ہے جس طرح کہ سونا چاندی اور تجارتی سازوسامان ذریعہ ہیں۔ لیکن علامہ کاسانی نے سونے چاندی کے مال تجارت ہونے کی جو عقلی وجہ بیان فرمائی ہے اس کے مطابق مال کی یہ تیسری قسم سونے چاندی کے حکم میں اور مال تجارت کے تحت آجاتی ہے کیونکہ اس میں سونے چاندی کی طرح یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اشیائے صرف کی طرح بعینہٖ استعمال ہوکر کوئی طبعی حاجت پوری کرسکے لہذا اس کے متعلق ذاتی استعمال کی شئے ہونے کا سرے سے کوئی احتمال ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ اگر کسی کے پاس سلائی کی ایک مشین ہو تو اس کے متعلق تو یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ ذاتی استعمال کے لیے ہو لیکن ایک ٹیکسٹائل مل کی مشینری کے متعلق کبھی یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ وہ ذاتی استعمال کے لیے ہو بلکہ اس کے متعلق صرف یہی متعین ہے کہ وہ کمانے اور فاضل دولت کو مزید بڑھانے کا ایک ذریعہ ہے، لہذا مال کی یہ قسم اپنی بناوٹ وساخت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور غرض و غایت کے لحاظ سے مالِ تجارت قرار پاتی ہے ۔

اب آپ بخوبی اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں نے کیا لکھا اور مولانا سندیلوی نے اس کا حلیہ بگاڑ کر اس کو کِس شکل میں پیش کیا ۔

اس کے بعد میری غلط فہمی نمبر ۵ کو لیجیے اس میں بھی حضرت نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ بھی ہر پہلو سے ٹھیک ویسا ہی ہے جیسا کہ پچھلے چار نمبروں میں تحریر فرمایا ہے ۔ مختصر الطحاوی کی جس عبارت کے متعلق لکھا ہے کہ مجھ سے اس کا مطلب سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے، ایک ایسی بات ہے جس میں ذرہ بھر صداقت نہیں اور جس کو بڑ ہی کہا جا سکتا ہے ۔ قارئینِ کرام کی خدمت میں گزارش ہے کہ شوال المکرم ۱۳۹۲ھ کے بیّنات میں میرے مضمون کی جو دوسری قسط شائع ہوئی ہے اس کو صفحہ ۲۹ سے چار صفحوں میں ملاحظہ فرمائیں، حقیقتِ حال واضح ہو جائے گی کہ میں غلط سمجھا ہوں یا یہ غلط سمجھے ہیں ۔

جس بحث کے ضمن میں مختصر الطحاوی کی وہ عبارت پیش کی گئی ہے اگر وہ سامنے ہو تو اس عبارت کا مطلب سمجھنا آسان ہو جاتا ہے ۔ بحث یہ چل رہی تھی کہ تجارت کا مطلب صرف "مبادلۃ المال بالمال" یعنی بیع و شراء تک محدود نہیں بلکہ وہ وسیع ہے جس کی متعدد شکلوں میں سے ایک کثیر الاستعمال شکل مبادلۃ المال بالمال ہے اور اس کے ثبوت میں میں نے فقہ حنفی کی کتابوں سے قاضی ابو یوسفؒ کا وہ قول نقل کیا ہے جس کے مطابق تجارت "عقد اکتساب المال" کا نام ہے جس میں عقدِ بیع بھی داخل ہے جس میں "مبادلۃ المال بالمال" ہوتا ہے اور دوسرے کئی عقود بھی داخل ہیں جن میں مبادلۃ المال بالمال نہیں ہوتا جیسے ہبہ، وصیت اور صدقہ جن میں سرے سے مبادلہ ہوتا ہی نہیں اور جیسے مہر، بدل خلع اور بدل عتق کہ ان میں مبادلہ تو ہوتا ہے لیکن بالمال نہیں ہوتا ۔ اور فقہاء نے قاضی ابو یوسف کے اس قول کو وہاں ذکر کیا ہے جہاں کتب فقہ میں یہ بحث ہے کہ عروضِ قنیہ اس وقت مالِ تجارت قرار پاتے ہیں جب ان کے متعلق نیتِ تجارت متصل بعملِ تجارت ہو یعنی نہ محض عملِ تجارت سے ان کا حاصل ہونا ان کو مال تجارت بناتا ہے اور نہ محض نیتِ تجارت سے وہ مالِ تجارت بنتے ہیں بلکہ جب دونوں چیزیں ایک ساتھ ہوں عملِ تجارت بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور نیتِ تجارت بھی تو اس وقت وہ مالِ تجارت قرار پاتے ہیں ۔ اور اس بحث میں اس قول کو اس لیے نقل کیا ہے کہ قاضی ابو یوسف کے نزدیک جو مال کسی شخص کو ہبہ، صدقہ، وصیت، مہر، بدل خلع، بدل صلح دم عمد، بدل عتق کے ذریعے حاصل ہوا ہو اور وہ اس کے متعلق نیتِ تجارت کرلے تو وہ مال مالِ تجارت بن جاتا ہے ۔ بخلاف امام محمد کے کہ ان کے نزدیک مذکورہ صورتوں میں حاصل شدہ مال نیتِ تجارت سے مالِ تجارت نہیں بنتا بلکہ صرف وہ مال نیتِ تجارت سے مالِ تجارت بنتا ہے جو شراء سے اور اجارہ سے حاصل ہوا ہو ۔ اور اس اختلاف کی وجہ بتلاتے ہوئے لکھا ہے کہ قاضی ابو یوسف کے نزدیک اکتسابِ مال کا ہر عقد عملِ تجارت ہے، جب کہ امام محمد کے نزدیک صرف مبادلۃ المال بالمال کا عقد ہی عملِ تجارت ہے ۔ اس اختلاف کو نقل کرنے کے بعد علامہ کاسانی نے بدائع میں امام محمد کے قول کو اصح لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ قاضی ابو یوسف کا قول بھی ان کے نزدیک صحیح ہے ۔ علامہ طحاوی اس اختلاف کو مختصر الطحاوی میں نقل کرنے کے بعد امام ابو یوسف کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بہٖ نَاْخُذُ ۔ جب کہ شمس الائمہ السرخسی نے مبسوط میں اس اختلاف کو نقل کرنے کے بعد کسی قول کو دوسرے پر کوئی ترجیح نہیں دی ۔

لہٰذا میں بلا خوفِ تردید پورے وثوق کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ مولانا سندیلوی نے مختصر الطحاوی کی اس عبارت کا جو مطلب سمجھا اور لکھا وہ قطعاً غلط ہے، مولانا کے الفاظ یہ ہیں :

> "اس میں تو یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی کو ہبہ وغیرہ کسی ایسے طریقہ سے مال ملا جس کا شمار معاوضات میں نہیں ہے مگر اسے لیتے وقت نیت یہ کی کہ میں اس کی تجارت کروں گا تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کی یہ نیت ہی اسے مالِ تجارت بنا دینے کے لیے کافی ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک محض نیت کافی نہیں ہے بلکہ عمل تجارت بھی اس کے ساتھ ہونا چاہیے ۔"

یہ الفاظ جس مطلب کو پیش کر رہے ہیں وہ اس وجہ سے غلط ہے کہ اس میں امام ابو یوسفؒ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امام طحاویؒ دونوں کی بالکل ترجمانی کی گئی ہے اور ان پر جھوٹ باندھا گیا ہے اس لیے کہ قاضی ابو یوسف اور امام طحاوی دونوں کا یہ مذہب ہے کہ عُوض کے مالِ تجارت بننے کے لیے نیتِ تجارت اور عملِ تجارت دونوں ضروری ہیں اور اس بارے میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، اختلاف جو کچھ ہے وہ تجارت کے مفہوم و مطلب میں ہے، اس کے ثبوت میں مبسوط اور بدائع الصنائع کی مندرج ذیل عبارتیں ملاحظہ فرمائیے۔

"ولو قبل الهبة والوصية فى مال بنية التجارة، عند ابى يوسف يكون للتجارة، وعند محمد لايكون للتجارة وكذلك فى المهر، وبدل الخلع والصلح عن دم العمد، محمد يقول: نية التجارة لاتعمل الامقرونة بعمل التجارة وهذه الاسباب ليست بتجارة، وابو يوسف يقول: التجارة عقد اكتساب المال، فما لايدخل فى ملكه الابقبوله فهو كسبه فيصح اقتران نية التجارة بفعله كالشراء والاجارة۔" (صفحہ ۱۹۸ جلد ۲ المبسوط للسرخسی)

"وجه قول من قال انه لايكون للتجارة فان النية لم تقارن عملاً هو تجارة وهى مبادلة المال بالمال فكان الحاصل مجرد النية فلا تعتبر ووجه القول الآخر ان التجارة عقد اكتساب المال ومالا يدخل فى ملكه الا بقبوله فهو حاصل بكسبه فكانت نيته مقارنة لفعله (ص ۱۲ جلد ۲ بدائع)

چوٹی کے فقہاء کی مذکورہ عبارتیں صاف بتلا رہی ہیں کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مابین اس مسئلہ میں جو اختلاف ہے وہ تجارت کے مفہوم و مطالب میں اختلاف کی وجہ سے ہے۔

قارئینِ کرام! آپ نے دیکھ لیا کہ میری جن پانچ غلط فہمیوں کی اشاعت و تشہیر کے لیے یہ مضمون لکھا گیا ان کی حقیقت کیا ہے، وہ میری غلط فہمیاں ہیں یا خود ان کی جو مجھ پر تھوپی گئی ہیں، شرم ہو تو ڈوب مریں۔

اور پھر جیسا کہ میں نے پیچھے بھی عرض کیا کہ ان مولانا صاحب نے قسم کھا رکھی ہے کہ میری صحیح سے صحیح بات پر غلطیوں کا کیچڑ ضرور اچھالیں گے خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہو۔ لہذا انھوں نے میری اس بات کی بھی بزعم خود تنقید فرمائی ہے جو میں نے تجارت کی تعریف پر بحث کرتے ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منجملہ دوسری باتوں کے لکھی تھی، مولانا صاحب کا یہ دعویٰ تھا کہ تجارت کا مطلب صرف مبادلۃ المال بالمال یعنی بیع و شراء ہے، میں نے اس کے جواب میں ایک بات یہ بھی لکھی تھی کہ اور تو اور خود صاحب بدائع نے تجارت کی جو تعریف لکھی ہے یعنی "کسب المال ببدل ہو مال" وہ بھی "مبادلۃ المال بالمال" سے عام ہے، کیونکہ مؤخر الذکر صرف معاملہ بیع پر صادق آتی ہے جب کہ اول الذکر معاملہ بیع اور معاملہ اجارہ دونوں پر صادق آتی ہے لیکن چونکہ اس سے مولانا کے دعوے کی تردید ہوتی ہے لہٰذا غلط تاویل کرتے ہوئے یہ لکھ ڈالا کہ ان دونوں تعریفوں میں کچھ فرق نہیں دونوں ایک ہیں۔

اسی طرح اس سے آگے مولانا صاحب نے میری ایک اور صحیح بات کی بھی نہایت بھونڈے اور غلط طریقہ سے تغلیط فرمائی، میری وہ بات مولانا کے اس مضحکہ خیز استدلال سے متعلق تھی جس میں انھوں نے کارخانے کی مشینری کو اس صابن پر قیاس فرمایا جو ایک دھوبی کپڑے دھونے کے لیے اپنے پاس ذخیرہ کرلیتا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ جس طرح دھوبی کے پاس ذخیرہ شدہ صابن پر زکوٰۃ واجب نہیں اسی طرح کارخانے دار کی مشینری پر بھی زکوٰۃ نہیں۔ میں نے اس پر یہ لکھا کہ زیر بحث مشینری کو دھوبی کے ذخیرۂ صابن پر قیاس کرنا صحیح نہیں کیونکہ نوعیت کے لحاظ سے یہ دو بالکل الگ چیزیں ہیں، صابن کپڑے کی میل کو دور کرنے کے ساتھ خود بھی دھل کر کپڑے سے دور ہوجاتا ہے اور اس سے کپڑے کی ہیئت و شکل میں سوائے اس کے اور کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا کہ وہ صاف ہو کر اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے۔ بخلاف مثلاً ایک ٹیکسٹائل مل کی مشینوں کے کہ وہ روئی کو سوت اور سوت کو کپڑے کی شکل میں بدل دیتی ہیں اور وہ روئی جس کی قیمت پہلے مثلاً ایک سو روپے تھی کپڑے کی شکل میں آنے کے بعد اس کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہوجاتی ہے اور یہ جو اس کی اصل قیمت میں نو سو روپے کا اضافہ ہوتا ہے اس میں ایک حصہ مشینوں کا اور باقی کاریگروں کی دماغی جسمانی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے، مشینوں کے حصہ کا مطلب یہ کہ گھسنے اور استعمال ہونے سے ان کی قیمت اور مالیت میں جو کمی واقع ہوتی ہے وہ تیار ہونے والی مصنوعات مثلاً کپڑے وغیرہ میں منتقل ہوجاتی ہے، اور یہ ایک ایسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات ہے جو حقیقت واقعہ کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے لہذا اس کو جس طرح اشتراکی مانتے ہیں جو کارل مارکس کے پیرو ہیں، اسی طرح سرمایہ دار بھی مانتے ہیں جو ان کے سخت مخالف ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں کارخانہ دار کو مصنوعات کی پوری آمدنی میں سے مشینوں کی گھسائی کی رقم بھی ضرور ملتی ہے اور وہ کارخانہ دار کا قانونی حق سمجھی جاتی ہے،

لیکن چونکہ میری اس تحریر سے مولانا کا مذکورہ بالا استدلال ایک ہنسی مزاح بن کر رہ جاتا تھا لہذا انھوں نے حسب معمول اس کی بھی تردید فرمانے کی کوشش کی اور جہالت وکم علمی کی بنا پر میرے استدلال کو مارکسی استدلال لکھ ڈالا اور خوش ہو گئے کہ ہم نے بڑا مؤثر حربہ استعمال کیا اب یہ کہیں کا نہیں رہے گا لیکن ان کو کیا پتہ تھا کہ اُلٹا ان کے علم کا مذاق اڑے گا اور خود بدنام ہوں گے۔ ہاں تو ایک ایسی بات جس کو اشتراکی اور سرمایہ دار سب صحیح مانتے ہیں، اس کی وجہ سے کسی استدلال کو مارکسی لکھ دینا اگر جہالت پر مبنی نہیں تو شرارت پر ضرور مبنی ہے۔

اور پھر کوئی ان مولانا صاحب سے یہ پوچھے کہ اگر دین و فقہ کی کسی بات کو سمجھنے سمجھانے میں کافر کی صحیح بات سے فائدہ اٹھانا غلط در غلط چیز ہے تو پھر آپ جس یونانی منطق سے قرآن حدیث اور فقہ کو سمجھنے سمجھانے میں مدد لیتے ہیں اور جس یونانی فلسفے سے اسلام کے بنیادی عقائد کو سمجھانے اور منوانے کی کوشش کرتے ہیں آخر وہ بھی تو یونان کے مشرکوں، اصنام وسیارہ پرستوں کے ذہن کی پیداوار ہے تو کیا آپ ہمیشہ غلط در غلط کا ارتکاب کرتے ہیں؟ اسی طرح آج یہ جو بعض جلیل القدر علماء دینی حقائق کو سمجھانے اور ذہن نشین کرنے کے لیے جدید فلسفے اور سائنس کے افکار ونظریات سے فائدہ اٹھاتے اور کام لیتے ہیں جو کافروں کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہیں تو کیا آپ کے نزدیک ان کا یہ طرزِ فکر اور طریقِ عمل غلط در غلط ہے اور وہ ناجائز کام کرتے ہیں؟

مولانا نے اپنے جوابی غلط نامے کے آخر میں میری خدمت میں جو ناصحانہ گزارش پیش فرمائی ہے وہ جس غرض و مقصد کے تحت ہے سمجھنے والے اس کو خوب سمجھتے ہیں مجھے اس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آخر میں میری بھی حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش ہے کہ میری اس تحریر سے اگر ان کو کوئی ذہنی تکلیف پہنچے تو مجھے کوسنے کی بجائے خود کو کوسیں، جن کی تحریر کا یہ قدرتی ردِّ عمل ہے جس کو میں نے حفیف سے حفیف کرنے کی کوشش کی ہے لیکن آخر ردِّ عمل، ردِّ عمل ہی ہوتا ہے۔ اگر میری غلط باتوں کو غلط کہا جاتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن جب صحیح باتوں کو پورے زور و شور کے ساتھ غلط کہا گیا اور اس میں انتہا کر دی تو اس کا جواب اس کے سوا نہیں ہو سکتا تھا جو میں نے اس تحریر میں پیش کیا۔

اسی طرح حضرات قارئین بینات کی خدمت میں بھی درخواست ہے کہ میرے اس مضمون کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے وقت اس مضمون کو ضرور سامنے رکھیں جس کے جواب میں یہ مضمون لکھا گیا ہے، میری عمر بھی پچاس سال ہے جس کے تیس سال شب و روز علم ہی میں گزرے ہیں۔ وَالحمدُ للہِ علیٰ ذٰلِکَ !

شاہ ولی اللہؒ کی تعلیم (اردو)

از

پروفیسر غلام حسین جلبانی

پروفیسر جلبانی ایم اے سابق صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے۔ اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی پوری تعلیم کا احصار کیا ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا ہے اور قدردان پڑھنے والوں کے اصرار پر دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ معیار طباعت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد

سندھ

© rasailojaraid.com